تھوڑی دیر کے بعد اندر بتی جلی اور انیس نے دروازہ کھولا۔

''نعیم۔'' اس نے سر سے لے کر پاؤں تک دو تین بار اسے دیکھا پھر بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''گھر سے۔''

بازو سے پکڑے پکڑے راستے کے کمروں کی بتیاں جلاتا ہوا وہ اسے اپنی سٹڈی میں لے گیا۔

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' نعیم نے معمولی لہجے میں کہا۔

چند لمحے تک اسے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد انیس گال پھلا کر جھلاہٹ اور طنز سے ہنسا: ''تین بجے ہیں۔''

جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ماما کو چلمچی میں گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ پانی لے کر آ گئی اور اس کے پاؤں دھونے لگی۔ اس وقت نعیم نے دیکھا کہ اس کے پاؤں میں صرف ایک سلیپر تھا۔ اتنی دیر میں انیس نے ایک صاف پاجامہ اور سلیپر لا کر رکھ دیے۔ جب ماما چلی گئی تو نعیم تولیے سے پاؤں خشک کرنے لگا۔

''شہر میں فساد ہو رہا ہے۔'' انیس نے کہا۔

''ہاں۔'' نعیم نے جواب دیا۔ پھر انیس کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ جھینپ کر ہنسا۔ ''نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں چلا آیا۔''

''تھکے ہوئے ہو؟''

''نہیں انیس۔'' نعیم نے کہا۔ ''مجھے...... بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''تو نیند آور دوا کھا لی ہوتی۔''

''او نہیں...... انیس۔ تم نہیں سمجھتے۔'' اس نے کرسی کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کئی لمحے تک وہ اسی طرح بڑا تیز تیز سانس لیتا رہا۔ پھر سانس ہلکا ہوتا ہوتا بالکل غائب ہو گیا۔ دفعتاً انیس کو ایک عجیب بے چینی نے گھیر لیا۔ نعیم کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور اس کے ماتھے پر چند پتنگے آرام سے چل پھر رہے تھے۔ اس کے بڑے سے بے رنگ اور تھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر انیس کو محسوس ہوا کہ یہ ایک مرے ہوئے آدمی کا چہرہ تھا۔ اس نے اس کے قدیم اندرونی دکھ کو صاف طور پر اس کے بے حس چہرے پر دیکھا اور اسے خیال ہوا کہ یہ صدیوں کا تنہا مصیبت زدہ انسان آج اس کے گھر میں آ کر مر گیا ہے۔ وہ گھبرا کر جلد جلد فساد کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ نعیم نے آنکھیں کھولیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔

''نہیں انیس میں...... تکلیف میں ہوں۔ میری بات سنو۔ میں اس لڑکی کے ساتھ سویا اور پھر اسے چھوڑ کر چلا آیا۔ طویل عرصہ گزر گیا ہے' وہ آج بھی میرے دل پر ہے۔ آج بھی۔''

''کون؟ کب؟''

''ایک لڑکی تھی۔ بہت پہلے۔''

''کون سی ایسی بات ہے۔'' کچھ دیر کے بعد انیس نے کہا۔ ''عمر میں کئی بار انسان کو محبت ہو جاتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ چند مذہبی رسوم......''

''نہیں یہ بات نہیں۔ محبت میں سب کچھ آجاتا ہے' رسوم اور رواج اور سب۔ میں ان باتوں میں یقین نہیں رکھتا۔ لیکن محبت کہاں تھی۔ میں محبت کے بغیر اس کے ساتھ سو گیا' حیوانیت کی خاطر' اپنی بدبختی اور افتاد کا بدلہ لینے کی خاطر۔ کمزور اور معصوم لڑکی۔ میں نے اسے تباہ کر دیا' محبت کے بغیر۔ اور اس کے بعد سے وہ میرے دل پر ہے۔ میں کسی بھی عورت سے محبت نہیں کر سکا' اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ اتنی مدت ہوئی میں کبھی دل میں امن لے کر اس کے ساتھ نہیں سو سکا۔ یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ وہ ہمیشہ میرے دل پر سوار رہی...... اور میرے دل پر وہ بھی سوار رہا۔'' نعیم نے سستی سے آنکھیں اٹھا کر انیس کی طرف دیکھا۔ ''وہ شخص جسے میں نے قتل کیا۔''

''قتل؟''

''نہیں میں نے اسے کوئی ضرب نہیں لگائی۔ صرف میں نے اسے...... قتل کر دیا۔ میدان جنگ میں وہ ایک بہادر اور خوش بخت شخص تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کی باتیں کیں اور میں نے اپنی بدبختی میں خواہش کی کہ وہ مارا جائے۔ میں بارود لا رہا تھا کہ میں نے انہیں دیکھا۔ بندوقیں سیدھی کئے ان کی سیاہ لمبی قطار رینگتی آ رہی تھی۔ خندق میں سے [illegible] کوئی جواب [illegible] وہ بزدل تھا۔ مجھے بچانے کے لئے باہر نکل آیا اور انہوں نے اسے چھلنی کر دیا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔'' وہ دیر تک رکا رہا۔ ''لیکن اس کا ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا زرد چہرہ چاند کی روشنی میں ابھی تک وہیں پڑا ہے۔ وہ کبھی میرے سامنے سے نہیں ہٹا۔ کبھی نہیں۔ اس کے بعد ایک مدت گزر گئی ہے میں کسی شخص سے قدرتی تعلقات قائم نہیں کر سکا۔ کوئی دوست نہیں بنا سکا۔ میں ہمیشہ لوگوں کی موجودگی میں بے چینی محسوس کرتا رہا' کبھی کسی پر اعتماد نہیں کر سکا۔ بتاؤ انیس میں کب تک زندگی کے جرائم کو ساتھ لئے لئے پھرتا رہوں گا۔ یا میں محض تمہارے سامنے ان کا اعتراف کر کے سرخرو ہو سکتا ہوں؟ بتاؤ۔''

انیس خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پہلی دفعہ وہ اس شخص کے لئے گہری ہمدردی اور رنج محسوس کر رہا تھا۔ شاید پہلی بار اس پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ شخص' جسے وہ اتنے عرصے تک احمق سمجھتا رہا تھا آخر اتنا احمق نہ تھا۔ کہ وہ بہت کچھ جانتا تھا مگر صرف سزا بھگت رہا تھا' کہ اس میں اتنا ضمیر' اتنی ذہانت موجود تھی کہ ایک طویل عرصے تک بے زبانی اور مظلومیت کے ساتھ ایک مسلسل موت کی اذیت برداشت کرتا رہا تھا۔

''میں اپنے ضمیر کے تسمے اٹھاتا رہا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں اسے ختم نہیں کر سکا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم قابل رشک ہو۔ تم نے اسے ختم کر دیا ہے۔ مگر کیسے؟ کیسے؟ خدارا بتاؤ......؟''

''پچھتاوے...... ہمارے سب سے لاحاصل جذبے ہیں۔'' انیس الرحمان نے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو بے حد کمینہ اور احمق محسوس کیا۔

''اور آج میں نے علی کو بھی دیکھا ہے۔'' نعیم بولا۔ ''میرا بھائی' جسے میں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ یہیں پر ہے۔ وہ میرا خون ہے پر میں نہیں جانتا کہاں پر ہے۔ اور میں نے ایک دفعہ ایک دوست سے باتیں کی تھیں جو مر چکا تھا۔ کیا دیکھتے ہو' یہ سچ ہے۔ میں نے صاف طور پر جیسے تم میرے سامنے بیٹھے ہو' دیکھا کہ وہ شخص مر چکا ہے۔ اور وہ میرا دوست تھا اور مجھ سے ہمکلام تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد کسی نے مجھے بتایا کہ وہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ لیکن موت تو ایک ہی ہوتی ہے اور میں نے اسے دیکھا ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس کی موت کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔''

''خیال ہوتا ہے خیال ہوتا ہے۔'' انیس خفا ہو کر بولا۔ ''تمہاری سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ اوٹ پٹانگ خیال دوڑاتے رہتے ہو۔ مت سوچو۔''

''اور آج شام نجمی کو میں نے دیکھا۔'' نعیم اسی طرح دیر تک باتیں کرتا رہا۔ انیس نے پھر اسے نہیں ٹوکا' بولنے دیا۔ وہ دنیا میں مستقل چھوٹے بڑے دکھ سہتا ہوا ایک شریف انسان تھا' جس کے دل پر سے' سارے وجود پر سے ایک عظیم بوجھ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا' بوجھ' جسے وہ بے زبان' باربردار جانوروں کی طرح ایک مدت تک اٹھائے اٹھائے پھرا تھا۔

آخر کار وہ تھک کر چپ ہو گیا اور کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ وہیں پڑا پڑا سو گیا۔ باہر ایک [illegible] تھا۔

UrduPhoto.com

اسی روز کوئی وجہ بتائے بغیر وہ عذرا کو لے کر ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گیا۔ روشن محل کے ملازم کئی روز تک اس کا سامان وہاں پہنچاتے رہے۔

پارلیمنٹ ہاؤس میں عجیب گہما گہمی تھی۔ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے آخری گفت و شنید ہو رہی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پارلیمنٹ میں اور گورنر جنرل ہاؤس میں کانفرنسیں بلاتے رہتے تھے اور ملک بھر سے سول نافرمانی کی تحریک کی دہشت ناک خبریں وصول ہوتی رہتی تھیں۔ ملک کی دونوں بڑی پارٹیوں' کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈر دلی میں جمع تھے اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملنے میں مصروف تھے۔ ہر طرف عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ملک کے مستقبل کے متعلق ہر کوئی اپنی سی پیش گوئی کر رہا تھا لیکن ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مکمل بے یقینی اور بے اعتمادی کی حالت میں تھا۔ روزانہ زندگی کا ہر کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ ملک کے بٹوارے کی خبریں گرم تھیں اور لوگ ایک جاں گسل درمیانی وقفے سے گزر رہے تھے۔ چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر ابتری کا وہ دور تھا کہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔

وزارت داخلہ کے پارلیمنٹری سیکرٹری کے دفتر میں بھی ایک خاموش ہنگامہ تھا جس میں سب شریک تھے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ' کلرک' چپراسی اور تمام چھوٹے بڑے اہلکار انیس کی سربراہی میں اپنے کام میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ کانفرنس روم کی طرف اور پارلیمنٹ کی عمارت کے باہر مظاہرہ کرنے والے ہجوم کی

طرف بھی متوجہ تھے۔ صرف نعیم تھا جو بیکار پھر رہا تھا۔ دفتر آتے ہی اس نے کام میں مصروف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر میں اسے سخت نیند آنے لگی اور وہ قلم رکھ کر کرسی پر ہی سو گیا۔ چند منٹ کے بعد جب وہ جاگا تو حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھا اور ہر چیز اجنبی اجنبی اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ وہ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے آگے جا کھڑا ہوا۔ باہر ایک نہایت چمکدار اور گرم صبح تھی اور دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ پارلیمنٹ کی عمارت جہاں ختم ہوتی تھی ایک کھلا سا صاف ستھرا میدان تھا جس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ سایہ دار درخت لگے تھے۔ اس سے پرے چوڑی سڑک تھی جس پر پولیس کا پہرہ تھا۔ پھر ایک لمبا چوڑا ریلا پھیلتا ہوا ہجوم تھا جو نعرے لگا رہا تھا اور پولیس کے پہرے کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کا ہلکا ہلکا شور تقریباً شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح نعیم تک پہنچ رہا تھا۔ وہ آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑکی میں کھڑا اس گرد کے بادل کو دیکھتا رہا جو ہزاروں پاؤں پٹختے اور کودتے ہوئے لوگوں میں سے اٹھ اٹھ کر ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ اس وقت وہاں کھڑے کھڑے نعیم نے محسوس کیا کہ وہ ان سب سے الگ تھلگ ہو گیا ہے' تنہا کھڑا ہے اس شور مچاتے ہوئے ہجوم اور مشین کی طرح کام کرتے ہوئے اہلکاروں سے اوپر' اس تنہا مقام پہ جہاں وہ کھڑا ہے۔ فضا خاموش اور خوبصورت ہے اور روشنی سارے میں پھیلی ہوئی ہے اور زندگی صاف' نیلے آسمان کی طرح پُرامن اور وسیع ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے مسرور سانس لیے اور انہیں الجھان کی موجودگی کو جو اس دوران میں آ کر اس کے قریب کھڑا [illegible] ہوا بیدار ہو رہا تھا۔

"غول کے غول ...... شور مچاتے ہوئے' اچھلتے کودتے دھکیلتے ہوئے" بے ترتیب اور غلیظ۔" ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ "ستوروں کے گلے کی طرح۔"

نعیم بے خیالی سے انہیں دیکھتا رہا۔ جب وہ دوبارہ جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تو نعیم برآمدوں میں ٹہلتا ہوا کانفرنس روم کی طرف نکل آیا۔ اس وقت وہ تمام اس کے سامنے سے گزر کر اندر داخل ہوئے: نہرو' راجگوپال اچاریہ' پٹیل' کرپلانی' جناح' لیاقت' بلدیو سنگھ۔ ایک ایک کر کے سب۔ پھر دروازے بند کر دیے گئے۔ وہ ٹہلتا ہوا واپس کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

دور کے ہجوم میں اسے دوبارہ وہ گمشدہ' عزیز چہرہ نظر آیا۔

"علی! علی!" گرم دھات کی طرح پگھل کر اس نے دہرایا اور آپ سے آپ اس کا تندرست بازو اس سمت میں اٹھ گیا۔ وہ پسینے اور گرد میں اٹا ہوا' بازو بلند کر کے اچھلتا ہوا سیاہ محبوب جسم ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ نعیم کا بازو آپ سے آپ نیچے گر گیا اور حیران پریشان نگاہیں ہزاروں انسانی سروں اور بازوؤں کے اوپر بھٹکنے لگیں۔ اب؟

اب اس کے سامنے علی نہ تھا' ہجوم بھی نہ تھا۔ اس کے سامنے اس کی گم شدہ جوانی تھی' اس کی ساری گزشتہ جدوجہد تھی' اس کی زندگی تھی۔ وہ تمام ارادے' امنگیں' ولولے وہ ساری جدوجہد محض اس دن کے لیے کی گئی

تھی۔ اس نے سوچا۔ "محض اس دن کے لئے؟" اس نے سوال کیا۔ "کہ آخر کار ہم بھلا دیے جائیں' کہ ایک طویل اور تکلیف دہ زندگی بسر کرنے کے بعد بوڑھے اور صرف بوڑھے ہونے کے لئے اس قدر اکیلے رہ جائیں؟ یہ کیا ہے؟ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ ساری زندگی' سارے دکھ کے معنی تلاش کرتا ہوا میں کہاں آ پہنچا ہوں؟ اپنی ساری جدوجہد کا جواز ڈھونڈنے میں کہاں آیا ہوں؟ آخر کہاں؟ محض یہاں؟......" اس وقت اس جوش سے چلاتے ہوئے ضدی اور گستاخ اور گرد آلود ہجوم کو دیکھ کر وزنی اور کند احساس کا ایک ریلا آیا' اور جیسے سمندر کی تہہ میں بیٹھا ہوا پتھر گہرے طوفان میں اک دم اٹھ آتا ہے' نعیم کے دل میں بھاری اور کند درد پیدا ہوا۔ بچھڑ جانے کا' پیچھے رہ جانے کا' بھٹک جانے کا' ضائع ہو جانے کا! چند منٹ کے لئے وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

پھر اس خلا میں سے اس کا موجودہ دکھ ابھرا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس نے تصور کیا اور صاف طور پر دیکھا کہ انیس اپنی تمام تر حیوانی قوت کے ساتھ اٹھ رہا ہے' بیٹھ رہا ہے' مڑ رہا ہے' کام میں مصروف ہے اور باتیں کر رہا ہے' تندہی سے فائلوں کے ڈھیر میں گم ہے اور انہیں پڑھ رہا ہے اور انہیں اٹھا کر پرنسپل سیکرٹری کے دفتر میں لئے جا رہا ہے اور کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہے اور ساری دنیا سے نفرت کر رہا ہے' دوسرے تمام لوگوں کو اور تمام واقعات کو اپنے طنز' اپنی دنیاداری اور اپنی ہوشیاری میں غرق کر رہا ہے' ایک بے حد باضمیر اور نفس کش اور وہ مشین ہے جو اپنے زور پر چلے جا رہی ہے' ایک حیوان ہے جو محض عادتاً زندہ ہے' کام کر رہا ہے اور [illegible] شخص [illegible] سوچا' یہ شخص اتنا بخوبی جانتا ہے [illegible] ایک [illegible] ٹھوس حقیقت نمایاں ہوئی۔ کہ یہ شخص خود غرضی' ذہنی بددیانتی اور انسانی کمزوری کی ایک عظیم علامت ہے۔

وہ مڑا اور دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر کے سارے منظر کو بظاہر کاہلی کے ساتھ دیکھتا ہوا وہ دھیرے دھیرے' لیکن حیرت انگیز سرعت اور صفائی کے ساتھ' بالآخر عقل کے اس عظیم جنگل میں سے نکل آیا جس میں ایک طویل عرصے سے گرفتار تھا۔ اس نے آہستہ سے جھک کر اپنی چھڑی اور ٹوپی اٹھائی اور چل دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" انیس الرحمان اٹھ کھڑا ہوا۔

"باہر۔"

"لیکن کانفرنس جاری ہے۔ اور مشتعل ہجوم۔"

"یہ صبح دیکھ رہے ہو۔" نعیم نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک دفعہ کسی نے' پتا نہیں کون تھا مجھ سے کہا تھا کہ خداوند تعالیٰ کی دنیا پر ہر صبح نئی دلکشی اور آزادی لے کر طلوع ہوتی ہے۔" اس نے سیدھا انیس کے چہرے پر دیکھا۔ "خدا حافظ۔"

پارلیمنٹ کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے آزادی اور مسرت کا لمبا سانس لیا۔

پھر وہ مظاہرین کے ہجوم میں گھس گیا۔ اسے ہر طرف سے دھکے پڑ رہے تھے اور سیاہ' غلیظ بدنوں سے پسینے کی تیز بو آ رہی تھی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ ہجوم کے دوسرے کنارے پر نکل آیا۔

''انقلاب زندہ باد۔'' کئی ہزار لوگ چلائے۔ وہ مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مختلف قسم کے نعروں کا شور اس کے کانوں میں آ رہا تھا۔ انقلاب زندہ باد۔ اکھنڈ ہندوستان زندہ باد۔ حکومت برطانیہ مردہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ سول نافرمانی' آزادی' آزادی.....

اس نے اپنی ٹوپی اتاری' اسے چھڑی کی نوک پر چڑھا کر بلند کیا اور پوری طاقت سے چیخا: ''آزادی..... زندہ باد۔''

اس کی آواز ایک چھوٹے سے دائرے میں گھٹ کر رہ گئی۔ چند لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی اس کی آزادی کے معنی سے بے خبر رہے۔

آپ سے آپ مسکراتا ہوا وہ مختلف سڑکوں پر چلتا رہا۔ پھر ایک جگہ دور سے روشن محل کی عمارت نظر پڑنے پر رک گیا۔

''ابھی آج میں نے رہائی پائی ہے۔ اس شے سے جس نے مجھے تمہارا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ تمہیں پتا چلتا تو ضرور خوش ہوتیں' تم میری بیٹی ہو۔'' اس نے زیر لب کہا۔ پھر اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

چند روز کے بعد فسادات زور پکڑ گئے اور لوگ شہر چھوڑنے لگے۔ ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں تو جان بچا کر بھاگنے والوں [illegible] قافلے [illegible] پیدل [illegible] کے تمام حصوں [illegible] فسادات اور لوگوں کے بھاگنے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ گو ابھی تک سیاسی گفت و شنید کا کوئی آخری فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن ملک کے بٹوارے کے متعلق ایک عام یقین پھیل رہا تھا۔ وہ جسے اب تک ملک کی عام آبادی نے محض خیال تو دلی سمجھ رکھا تھا حقیقت بنتی ہوئی نظر آئی تو لوگ دفعتاً خالی الذہن ہو گئے۔ فسادات کی حیوانیت سر پر سوار ہوئی تو بالکل بوکھلا گئے اور گھر بار چھوڑ چھاڑ' منزل کا تعین کیے بغیر بھاگ اٹھے۔

روشن محل کے وسیع ہال میں کنبے کے سبھی افراد جمع تھے' سوائے نعیم کے۔ عذرا جو ابھی ابھی آئی تھی' بظاہر سکون کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ لگی زرد رو نجمی سہمی ہوئی سیدھی بیٹھی تھی۔ آگے دو کرسیوں پر پرویز کی بیوی اور لڑکا آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دوسرے بڑے صوفے میں روشن آغا اور ان کی بیوی دھنسے ہوئے تھے۔ صرف پرویز ہاتھ پشت پر باندھے' سر جھکائے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ کمرے کی فضا پر عجیب گھٹن اور اداسی طاری تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔

پرویز دو گھنٹے سے متواتر بول بول کر اب خاموش ہو چکا تھا۔ صبح سے وہ روشن آغا کو سب کے ساتھ پاکستان جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے دلی سے لاہور جانے والے ہوائی جہاز پر سب کی سیٹیں بک کرا لی تھیں اور سامان روشن آغا کو خبر کیے بغیر باندھا جا چکا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے۔ اس کی بنیاد میرے بزرگوں نے رکھی تھی اور یہیں ہم سب پیدا ہوئے۔ کوئی کیا کہے

گا؟'' وہ سارا وقت صرف یہی کہتے رہے اور پرویز کے اور دوسرے گھر والوں کے تمام دلائل بیکار ثابت ہوئے۔

اب سب بیکار تھا۔ کبھی کبھی پرویز ناامیدی کے عالم میں چلا اٹھتا۔ ''روشن پور روشن پور یہاں بیٹھ کے آپ کہتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ روشن پور کے لوگ ابھی تک آپ کے وفادار ہیں؟ آج آپ روشن پور میں داخل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے منشی کو اور ہمارے سب کارندوں کو قتل کر دیا ہے۔ آج ہمیں وہاں کوئی نہیں جانتا۔''

''پاگل پن کی باتیں مت کرو۔'' وہ جواب دیتے۔

آخر پرویز جیبوں میں ہاتھ ڈال کر' ٹانگیں پھیلا کر ان کے درمیان آ کھڑا ہوا: ''تو پھر ہم سب جا رہے ہیں۔'' اس نے دھیمے' قطعی لہجے میں کہا۔

روشن آغا نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو نظریں چرائے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر انہوں نے سوالیہ نظروں سے عذرا کو دیکھا۔

''نعیم نے عمر بھر بھلا کسی کی بات مانی ہے؟'' پرویز غصے سے بولا۔ ''عذرا ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ وہ جائے نہ جائے۔''

روشن آغا نے دوبارہ اپنی بیوی کو دیکھا۔ یکلخت بے حد اکتا کر انہوں نے کہا: ''تو پھر شوق سے جایئے۔'' اور منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔ پرویز تھوڑی دیر گھبراہٹ میں چکر لگانے کے بعد ٹوپی اور برساتی اٹھا کر بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

UrduPhoto.com

سہ پہر کے وقت وہ سب ایئر پورٹ کو روانہ ہوئے۔ روشن آغا اپنے کمرے کے دروازے پر سب روتے ہوئے گھر والوں کو الوداع کرنے کے لئے آئے۔ جاتے جاتے سب نے ان سے وعدہ کیا کہ حالات بہتر ہونے پر واپس آ جائیں گے اور اگر خدانخواستہ حالات خراب ہو گئے تو روشن آغا بھی ان سے آن ملیں گے۔

شام تک روشن محل کے تمام نوکر غائب ہو گئے۔ چوکیدار اور خاکروب تک۔ صرف روشن آغا کا ملازم خصوصی' حسین' وفاداری سے ان کے بند دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ رات سے پہلے پہلے روشن محل کو آگ لگا دی گئی۔ بارش رک گئی تھی اور بلوائیوں کے تین گروہ یکے بعد دیگرے جانے کہاں سے وارد ہوئے اور نہایت خاموشی سے اس مہیب' دو منزلہ عمارت کا مشرقی حصہ جلنے لگا۔ نعیم اور عذرا کے جانے کے بعد سے یہ حصہ خالی پڑا تھا۔ روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے۔ جاتے جاتے انہوں نے بلوائیوں کی جھلک دیکھی۔ وہ لمبے تڑنگے سکھ کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے جو ان کا سامان نکال کر لان میں جمع کر رہے تھے اور اسے آگ لگا کر بھتنوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔

کئی ایک کوٹھیاں جل رہی تھیں۔ پرانے' وسیع اور جانے پہچانے گھر جن میں عمر بھر آنا جانا رہا تھا۔ اور ان کے باسی' پرانے وقتوں کے نجیب الطرفین تعلقہ دار اور سرکاری افسر جو ایسے اچھے دوست تھے۔ سڑک پر جانے سے احتراز کرتے ہوئے روشن آغا اور حسین مکانوں کے پیچھے پیچھے کھیتوں اور غیر آباد زمینوں میں سے بھاگتے ہوئے

گزر رہے تھے۔ رات پڑ چکی تھی۔ گڑھوں میں بارش کا پانی رکا ہوا تھا۔ وقفے وقفے پر وہ دونوں تاریکی میں تیز تیز چلتے ہوئے ایک دم پھسل کر کسی گڑھے میں گر پڑتے۔ حسین اپنے آقا کو کمر سے پکڑ کر باہر نکالتا اور وہ اپنے خاص انداز میں کوستے ہوئے پھر بھاگنے لگتے۔ دونوں سر سے پاؤں تک کیچڑ آلود تھے۔ ایک جگہ پر تھک کر روشن آغا رک گئے اور ہانپنے لگے۔ دائیں جانب ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس میں روشنیاں جل رہی تھیں اور پردے سکون کے ساتھ پھڑپھڑا رہے تھے۔

"حسین۔" روشن آغا نے اداسی سے پوچھا "تم کبھی ایسی راتوں میں باہر سے گزرے ہو جبکہ اندر لوگ اپنے پردوں کے پیچھے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوں۔"

"ہاں سرکار......"

"بیشک بیشک...... پر کیسا عجیب لگتا ہے۔"

وہ پھر چل پڑے۔ حسین آگے آگے چلتے ہوئے بولا۔ "مجھے آگے جانے دیں حضور۔ گڑھوں کا پتہ چلتا رہے گا۔ آپ بچ جائیں گے۔"

لیکن اندھیرے اور عجلت کے باعث وہ ایک دوسرے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ رکھ سکے اور جب حسین تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر کسی پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں گرتا تو پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے آواز نکلتی روشن آغا بھی پیچھے سے آتے ہوئے ہاتھ پھیلائے ہوئے دھڑام سے اس کے اوپر گر پڑتے۔ انہیں عجیب سا احساس ہوا۔

آخر ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک پر نکل آئے۔ سڑک پکی تھی اور ذرا فاصلے پر ایک چھوٹا سا پل تھا جس کے نیچے برساتی نالہ شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اس سے پرے ایئرپورٹ کی عمارت کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ روشن آغا نڈھال ہو کر پل پر بیٹھ گئے۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ وہ وہیں پر بیٹھے رہے اور بارش ان کے جسموں سے گڑھوں کا کیچڑ دھوتی رہی۔

"حسین...... ہم اتنے اچھے دوست ہو سکتے تھے۔" اچانک روشن آغا نے کہا۔

"ایں؟ جی جی...... میں آپ کا خادم سرکار......"

"یہ سب بیکار ہے۔" انہوں نے ہاتھ کی ہلکی سی جنبش سے کہا۔

"کوئی کچھ بھی نہیں ہے۔ آج جہاں پر تم ہو وہیں پر میں...... تم نے دیکھا؟ یہ زندگی کی آخری سطح ہے۔ آخری اور یقینی۔"

پھر ان کی نظر اندھیرے میں چمکتی ہوئی کلائی کی گھڑی پر پڑی۔ نو بجے تھے۔ جہاز چھوٹنے میں ابھی دو گھنٹے ہیں انہوں نے سوچا' وہ کچھ دیر ابھی اور سستا سکتے ہیں اور زندگی کے اس منطقے پر غور کر سکتے ہیں اور یہ بارش کتنی سکون بخش ہے گو ایئرپورٹ پہنچتے ہی انہیں پرویز سے لے کر خشک کپڑے پہن لینے چاہئیں۔

(۴۵)

جب وہ دلّی سے چلے تو پچاس مردوں عورتوں بچوں اور چند بیل گاڑیوں کا مختصر سا صاف ستھرا قافلہ تھے۔ تین روز کی مسافت کے بعد وہ قافلہ ڈیڑھ ہزار انسانوں اور اتنے ہی جانوروں کے ایک لمبے چوڑے جلوس کی شکل اختیار کر چکا تھا اور ابھی وہ انبالے سے دس میل دور تھے۔ اس جلوس کی تشکیل میں کسی تجویز یا ترتیب کا لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ اگر ڈھنگ سے چلایا جاتا تو وہ دو فرلانگ مربع میں بہ آسانی سما سکتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ جو لوگ درمیان میں چل رہے تھے انہیں دور دور تک قافلے کی حدود کا پتہ نہ تھا۔ اگر ہوائی جہاز پر چڑھ کر دیکھا جاتا تو ایک بڑا سا کنکھجورا' ہزاروں چھوٹی بڑی ٹانگوں والا زمین پر چلتا ہوا دکھائی دیتا۔

وہ پچاس' جو ابتدا میں ساتھ چلے تھے' ابھی تک یکجا تھے۔ وہ قافلے کے عین درمیان میں چل رہے تھے اور یہی ایک ترتیب تھی جو قائم رہ گئی تھی۔ یعنی قافلے کا حجم ان کو مرکز قرار دے کر چاروں طرف بڑھنا شروع ہوا تھا اور ایک سا بڑھتا چلا گیا تھا' جیسے گھوڑے کا بچہ تیزی کے ساتھ جوان ہو جائے' یا ساحلی سمندروں پر جب کوئی پیراک تیرنے لگے تو جیسے جھاگ اس کے چاروں طرف اکٹھا ہونا شروع ہو جائے۔ گو ان کی دوستی چند روزہ تھی پھر بھی ان میں ایک عجیب غیر معروف قسم کا احساس رفاقت پیدا ہو چلا تھا' جیسے چند ناواقف لوگ کسی شہر میں جا نکلیں اور وہاں بغاوت شروع ہو [illegible] ایک تو وہ تعداد میں کم اور خوش پوش تھے دوسرے ان کی آپس کی شناسائی کی مدت نسبتاً کئی گھنٹے زیادہ کی تھی۔ اس لحاظ سے یہ جماعت اس غریب الوطن قافلے کی گویا ارسٹو کریسی تھی۔ دلّی پولیس کے چند سپاہی' جوان کے ساتھ ہوئے تھے' زیادہ تر ان کے ساتھ ہی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ یہ بات بھی انہیں دوسروں سے ممیز کرتی تھی' گو ان کی زیادہ تر باتیں اسی قسم کی ہوتیں کہ مثلاً نئے آنے والوں کی فوج گندی اور بدبو دار تھی اور کہ وہ اپنے ہمراہ گھوڑوں اور بیلوں کے علاوہ گدھے' خچر' کتے' بلیاں اور مرغیاں تک لے آئے تھے۔ اس موضوع پر متفرق طبقے کے پچاسوں افراد کے سر شرم سے جھک جاتے جیسے کہ اس کی ذمہ داری براہ راست ان پر آتی تھی۔

جنہوں نے کبھی تھکے ماندے' بے گھر اور دہشت زدہ لوگوں کے درمیان سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے قافلوں میں سب سے بڑی وبا افواہوں کی ہوتی ہے۔ ایک سے ایک بے بنیاد افواہ منٹوں میں قافلے کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیلتی جا رہی تھی اور نئی سے نئی پھیلتی تھی' یعنی کہ کسی افواہ کی عمر چند گھنٹے سے زیادہ کی نہ ہوتی تھی۔ لوگ اتنے خالی الذہن ہو چکے تھے کہ محض چلتے جاتے اور افواہیں پھیلانے کے سوا لگتا تھا کہ ان کو کوئی کام ہی نہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ جان بوجھ کر افواہیں پھیلاتے تھے یا یہ کہ ان کے درمیان کوئی کنبہ افواہیں پھیلانے کے ماہروں کا موجود تھا' بلکہ یوں ہوتا کہ بات چیت کے دوران کسی کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ کسی دوسرے کے سر پر سارے وقتوں کی

تھکن، بھوک پیاس اور دہشت بن کر سوار ہو جاتا اور قافلے کی تمامتر بے ترتیبی کے باوجود برقی رو کی طرح آناً فاناً ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل جاتا۔ زیادہ افواہیں دو قسم کی تھیں اور دونوں انتہائی متضاد قسم کی تھیں۔ یا تو وہ انتہائی دہشت پسند تھیں، مثلاً یہ کہ اگلے پڑاؤ پر قافلے پر حملہ ہو گا یا انتہائی پُر امید، کہ اگلے شہر میں حکومت نے ان کے لئے نئے لباس اور تازہ کھانے مہیا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہی دو قسم کی افواہیں بار بار الفاظ کا مختلف جامہ پہن کر لہروں کی طرح آ رہی تھیں اور کسی کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس شدید مضحکہ خیز صورتحال کو محسوس کر سکتا۔ لوگ افواہوں میں باتیں کرتے، عام روز مرہ کی کوئی بات نہ کرتا۔ تازہ ترین خبر یہ تھی کہ انبالے کے سٹیشن پر ان کے لئے ایک خالی ریل گاڑی تیار کھڑی تھی جس کے ساتھ ایک بہت بڑا باورچی خانہ لگا ہوا تھا اور پولیس کی بھاری جمعیت ان کی حفاظت کے لئے موجود تھی۔

ان پچاس میں نعیم بھی تھا۔ اس نے تین روز سے کسی سے بات نہ کی تھی۔ اس کا بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ غلیظ اور لباس گندا ہو چکا تھا۔ ایک موقع پر رات کے اندھیرے میں جب قافلے میں بلا وجہ بھگدڑ مچی تو اس کا ایک جوتا گم ہو گیا تھا۔ دوسرا اس نے خود اتار کر پھینک دیا۔ اس کی جیبیں خالی تھیں اور کوئی سامان ساتھ نہ تھا۔ اپنے آپ میں گم چلتا ہوا، کبھی کبھی وہ خود بخود مسکرانے لگتا، پھر سنجیدہ ہو جاتا، پھر پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھتا اور چلتا جاتا۔ اس نے ایک دفعہ بھی یہ یاد کرنے کی کوشش نہ کی تھی کہ عذرا سے اس کی کیا باتیں ہوئیں، کن حالات میں وہ اس سے جدا ہوا [illegible] شریک ہوا تھا۔ سب کچھ آپ سے آپ ہوتا چلا آیا تھا۔ کبھی کبھار اسے صرف اتنا محسوس ہوتا کہ وہ ایک ان دیکھی، ان جانی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا جہاں پہنچنے سے پہلے...... یا جہاں پہنچنے پر، یا پہنچنے کے بعد...... ایک بہت بڑی قوت، خوبصورت اور جاندار اور لازوال اس میں پیدا ہونی تھی، نجانے کیسی اور کیونکر، لیکن اس کے نتیجے کے طور پر وہ اڑنے لگے گا یا ہوا میں تحلیل ہو جائے گا یا زمین کے اندر چلا جائے گا یا جانے کیا، پر کچھ نہ کچھ ضرور ایسا ہو گا جو زبردست اور معرکہ خیز ہو گا۔ اس عظیم قوت کی ہلکی ہلکی لہریں وہ ابھی سے اپنے اندر پھوٹتی ہوئی محسوس کر رہا تھا اور اس سرشاری میں ان سب کے ساتھ چل رہا تھا، بھاگ رہا تھا، رک رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ اپنے گرد و نواح سے اس کی بے خبری اور لاپروائی اور اس کی بے سرو سامانی اور عجیب و غریب ہیئت دیکھ کر چند عورتیں، جو ایسے موقعوں پر خصوصاً توہم پرست ہو جاتی ہیں، مجذوب سمجھ کر اس کی نگہداشت کر رہی تھیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کھانے کو اسے دیتی رہتیں اور مستقبل کے متعلق بے سرو پا سوالات کرتی جاتیں جن کا جواب دیے بغیر اور شکریہ ادا کیے بغیر وہ ان سے خوراک قبول کرتا اور بھاگتا جا رہا تھا۔ عورتیں خاموشی کو معنی خیز سمجھ کر اور بھی مرعوب ہو گئی تھیں اور ہر وقت اس پر نگاہ رکھنے لگی تھیں۔ مردوں میں سے زیادہ تر نے اسے محض مخبوط الحواس سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ انبالہ پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں طوفان خیز بارش نے آ لیا۔

بارش کی تیز بوچھاڑ سہتے ہوئے متواتر پانچ گھنٹے تک انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اور باہر سڑک پر کھڑے رہے۔ اس دوران میں دو گاڑیاں دلی کی جانب سے آئیں اور رکے بغیر سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر گئیں۔ ان

UrduPhoto.com

کی تنگی ڈھلوان چھتوں پر بھی اتنے ہی لوگ بیٹھے تھے جتنے کے ان کے اندر' اور تیز ہوا میں اڑتے اور گیلی چھت پر سے پھسلنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے عجیب و غریب ہیئت میں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ نعیم کو یاد آیا کہ جب وہ بچپن میں سفر کیا کرتا تھا تو شیڈ میں کھڑی یا پانی لیتی ہوئی کسی خالی گاڑی کی چھت پر نیلی وردی والے آدمی کو خطرناک انداز میں چلتے تعجب سے دیکھا کرتا اور اسے سرکس کے کرتب سیکھا ہوا کوئی آدمی خیال کیا کرتا تھا۔ آج وہ ہزاروں سیدھے سادھے لوگوں کو کرتب دکھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا...... ''اور ایسے خراب موسم میں......'' اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

آخر جب سٹیشن کے عملے کے لوگ انہیں باہر نکالنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اندر جا چکے تھے تو طوفانی بارش اور خالی یک رنگ لائنوں کے نظارے سے یکلخت مایوس ہو کر وہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگے۔ باہر نکلتے ہوئے' جیسا کہ معمول ہو چکا تھا' کسی نامعلوم وجہ سے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھاگ دوڑ میں اچانک نعیم اور علی آمنے سامنے آ گئے۔

''تم نے کہا: 'نکل جاؤ' اور میں نکل گیا۔ اپنے باپ کے گھر میں میرے لئے جگہ نہ تھی۔ کیوں نہ تھی؟ محض اس لئے کہ تم مجھ سے پندرہ برس پہلے پیدا ہوئے تھے اور لڑائی میں تم نے بہادری کا تمغہ حاصل کیا تھا اور جاگیرداروں کے گھر بیاہ کیا تھا اور سرکار کے خلاف جلوس نکالے تھے' محض اس لئے؟ اب میں کہاں جاؤں؟ میں نے سوچا۔ پر میں [illegible] جو خطرناک ہوتی ہیں تو کہیں دکھائی نہیں دیتی' اور آج ماں کی...... ہمیں سیراب کر رہی ہے۔ لو یہ بوری' اس کی ٹوپی بنا کر اوڑھ لو۔ تیری خیر ہے۔ لاؤ میں بنا دوں' تمہارا ایک ہاتھ تو کام سے گیا۔ گیلی ہے پر پھر بھی کچھ بچاؤ تو کرے گی۔ میں سینکڑوں بار پردیس میں بھوکا سویا ہوں لیکن اس رات کی بھوک' اور اپنے گھر پر پردیس کا وہ احساس مجھے آج تک یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن بڑی ماں نے...... بڑی ماں بھی مر گئی' اللہ رحم کرے...... اس دن بڑی ماں نے بھنی ہوئی قاشت اور گوبھی کا شوربہ آگے رکھا تھا اور مجھے زور کی بھوک لگی تھی اور تم نے کہا تھا نکل جاؤ۔ تم کیا جانتے ہو' تمہیں اس طرح کھانے کے آگے سے اٹھا کر کبھی گھر سے باہر نہیں نکالا گیا۔ تمہیں کیا پتا۔ تم تو روشن محل میں جا کر جاگیردار بن گئے' ہمارے خدا بن گئے۔ کاش یہ سارے سوار کچھ دیر کے لئے رک جائیں تو ہم گاڑی کے نیچے گھس کر بارش سے تو بچ سکتے ہیں۔ مگر یہ تو بس بھاگ رہے ہیں جیسے ماں کی بارات میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ عائشہ تو رستے میں ہی مر جائے گی۔ یقیناً۔ دیکھو کیسے بندریا کی طرح چارے میں سے منہ نکالے دیکھ رہی ہے۔ یہ اسی طرح پچھلے دس برس سے چپ چاپ دیکھ رہی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ چالتی ہے' بس کام کئے جاتی ہے اور گھلتی جاتی ہے۔ بڑی محنت سے گاڑی پر سائبان کھڑا کیا تھا' کل رات کی بارش میں اڑ گیا۔ اب پانی چارے میں سے رس رس کر اس کے جسم پر اکٹھا ہو رہا ہے۔ یہ کبھی سفر کے خاتمے تک نہیں بچ سکتی۔ لیکن سفر کا خاتمہ؟ ہونہہ' تمہیں پتا ہے کہاں ہو گا۔ ان سارے برسوں جو تم بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے سسرال والوں کے پاس رہتے رہے' پھر تم نے وائسرائے کی

نوکری کر لی اور بڑے آدمی بن گئے' تمہیں کبھی خیال آیا کہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے جس میں تمہارے باپ کا خون ہے اور وہ کہاں پر ہے' بھوکا ہے یا سیر ہے' اور اس کی بیوی اور بچے' یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا بھائیوں میں خیال رکھا جاتا ہے۔ اور کیا تم میری زندگی تو نہیں گزارتے تھے۔ تھو تھو تھو۔ یہ بارش اور ہوا کا زور دیکھو' بالکل طوفان ہے طوفان۔ تم حیران ہو رہے ہو؟ مجھے سب پتا چلتا رہا۔ میں پردیس میں رہا پر ایک ایک پل کی مجھ کو خبر رہی۔ کہ تم کئی برس بیمار بھی رہے اور روشن محل میں ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر آ کر تمہارا علاج کرتا رہا۔ پھر تم تندرست ہو گئے اور ہر روز موٹر میں بیٹھ کر وائسرائے کے دفتر کام پر جانے لگے۔ تم کبھی روشن پور نہ گئے۔ لیکن میں بھی بیمار رہا اور میری بیوی بھی اور ہمارا علاج کرنے کے لئے کون تھا۔ جلاوطنی؟

''لیکن تم تو سدا عیش میں رہے۔ جب باپ جیل چلا گیا تو تم چچا کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور انگریزی سکولوں میں پڑھتے رہے اور گرمیوں میں پہاڑ پر جاتے رہے۔ اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو کیا جاگیرداروں کی لڑکی کے ساتھ شادی نہ کر سکتا تھا؟ خیر اگلی بات یہ دیکھتے ہو کہ مجھے ان سب باتوں کا کسی نہ کسی طرح سے پتا چل ہی گیا۔ پھر ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی...... کہ اب وہ سب کیا ہوا؟ وہ محلات' اور بڑے بڑے بارسوخ لوگ جو تمہارے رشتہ دار تھے اب کہاں گئے؟ ان کا کیا فائدہ ہوا۔ بتاؤ؟ اب تم پھر ہمارے ساتھ اکیلے ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ سب نے تمہیں چھوڑ دیا؟ تھو تھو تھو۔ وہ تمہیں چھوڑ ہی دیتے' جلد یا بدیر' میں جانتا تھا۔ ذرا دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے فقیروں سے [illegible] ٹانگوں میں پہلے دو دن سخت درد اٹھا تھا پھر کل رات بارش پڑنے سے سوج گئیں اور درد ختم ہو گیا۔ اب یوں لگتا ہے جیسے لکڑیوں پر چل رہا ہوں۔ یہ دیکھو' چھوٹے چھوٹے کیکر کے تنے برابر موٹی ہو رہی ہیں ماں کی...... ٹانگیں۔ پر شکر ہے کہ درد تو ختم ہوا' میری جان لے رہا تھا۔ تم عائشہ کے جوتے پہن لو ابھی نکال کر دیتا ہوں۔ یہ تو گھبراؤ نہیں وہ بھی سیدھے تلے والے جوتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں ایڑی والے جوتے نہیں پہن سکتے۔ اور تمہاری بیوی اس نے بھی تمہیں چھوڑ دیا......''

نعیم کو اس بات کی حیرت نہ تھی کہ علی کو ان ساری باتوں کا علم کیسے ہوا۔ اس کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ تو یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی' کل کا گنوار کسان لونڈا آج ایک دم بڑا ہو گیا تھا اور بدلی ہوئی آواز میں' بدلے ہوئے لہجے میں' بالکل بدلی ہوئی باتیں کر رہا تھا۔ اپنی حیرت میں اسے یہ خیال نہ رہا کہ وہ اس سے کم و بیش بارہ برس کے عرصے کے بعد مل رہا تھا۔

علی کے لہجے کا زہریلا پن آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ آخر نعیم محض اس کا بھائی تھا جو اتنا عرصہ بھٹکنے کے بعد اس خستہ حالت میں لوٹا تھا اور اس کی دیکھ بھال کرنا اس کا فرض تھا۔ کسانوں کی سی صاف دلی کے ساتھ اس نے سب کچھ معاف کر دیا' بھلا دیا' اور وہ تھکے ہمدرد اور رنجیدہ لہجے میں نعیم کو بتانے لگا۔

''میں پنجاب چلا گیا۔ لاہور میں ان دنوں حالات اچھے نہیں تھے پھر بھی میں دو سال تک وہاں رہا اور کوئی آدھی درجن ورکشاپوں میں کام کیا۔ ان دو برسوں میں چھ مہینے جیل میں کاٹے۔ جہاں میں رہتا تھا وہاں چوری ہو گئی

UrduPhoto.com

اور انہوں نے شبے میں پکڑ کر مجھے قید کروا دیا۔ چھ مہینے انہوں نے مجھ پر ظلم کیا۔ پہلی بار میری ٹانگیں جیل میں سوجی تھیں جب میں دو دن تک متواتر ایک ہی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔ یہ دوسری بار ہے۔ پر لاہور کی لسی مجھے نہیں بھولتی۔ کیا جاڑے کیا گرمی وہاں پر لسی پیتے ہیں اور سارا دن اس کے بعد نہ آپ کو بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ لیکن میرے پاؤں میں چکر تھا۔ عائشہ کو لینے آیا تو پھر لاہور نہ گیا۔ جالندھر میں ایک سیمنٹ فیکٹری تھی وہاں نوکری کی' پھر جنگ چھڑ گئی۔ اب میں فوج میں جانے کے لئے سر مارنے لگا۔ ان دنوں پہلی بار عائشہ بولی اور کہنے لگی: "باؤلے ہوئے ہو؟ مت جاؤ۔ لڑائی پہ مت جاؤ مت جاؤ۔" پھر وہ رونے لگی۔ اس کے بعد وہ زیادہ ہی چپ چاپ ہو گئی۔ کبھی روئی بھی نہیں۔ دیکھو کیسے چارے میں سے منہ نکالے بیٹھی ہے اور تکلیف سہہ رہی ہے' جیسے گائے نے تازہ تازہ بچہ دیا ہو۔ تمہارا خیال ہے اس نے تمہیں پہچانا نہیں؟ شرما لگاتے ہو؟ اس نے تمہیں سولہ آنے پہچان لیا ہے اور سولہ آنے پہچان لیا ہے پر وہ کبھی نہیں ہنستی' نہیں شرماتی۔ یا اللہ میری ٹانگیں پھٹ جائیں گی۔ اگر یہ ہوا اتنا شور نہ مچائیں تو تم میری ٹانگوں پر بارش کے قطروں کی آواز سن سکتے ہو۔ ڈھول کی طرح بج رہی ہیں۔ لیکن میں جنگ میں ہر قیمت پر جانا چاہتا تھا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری نقالی میں میں ایسا کرنا چاہتا تھا تو غلط سمجھتے ہو۔ نہ ہی مجھے اپنی ہتھیلی بازوؤں سے کوئی بیر تھا یا تمغوں کی حرص تھی۔ بس میں بالکل اکتا چکا تھا۔ ان دنوں میں معمولی سی بات پر قتل کر سکتا تھا۔ بس میرے سر میں یہ بات سما گئی تھی کہ جنگ ہی ایک کام ہے جو کہ مرد کے لائق ہے۔ لیکن ہوا کیا؟ وہ ہمیں پر ادھر ادھر پریڈ کرواتے رہے اور جنگ [illegible] جانے کا ذکر سنتے سنتے کان پک گئے تو ایک دن میں نے حوالدار میجر سے کہا: 'جس روز تو پیدا ہوا تھا اسی دن تیری ماں کا دودھ پھٹ گیا اور تو بزدل ہو گیا تھا' رات بھر میں کوارٹر گارد میں رہا۔ صبح کرنل کے پیشی ہوئی۔ میں بکتا رہا تھا اس کو بھی سنائیں۔ کورٹ مارشل ہوا اور مجھے قید کر دیا گیا۔ شکر ہے گولی سے بچ گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ایک سال تک کلکتے میں ہی مزدوری کرتا رہا۔ پھر وہاں سے یہ سیاست شروع ہوئی۔ ہڑتالیں' اور جلوس اور دہشت پسندی۔ تم یقین نہیں کرو گے۔ مگر یہ سچ ہے کہ میں ان میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ پر جانے یہ کیسے ہوا...... کیسے ہوا کہ میں آہستہ آہستہ ان کا پکا معتبر آدمی بن گیا۔ ایک قسم کا لیڈر۔ آپ سے آپ ہی یہ سب کچھ ہو گیا۔ میں دلی آ گیا۔ اب بارش تھمتی جا رہی ہے۔ دیکھو اُدھر سے بادل پھٹ گئے ہیں۔ تمہیں بوجھ لگ رہا ہے تو بوری اتار کر گاڑی میں رکھ دو۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اور اگر چاہو تو جوتوں کے لئے عائشہ کا شکریہ ادا کر دو۔ خوش ہو جائے گی۔ ابھی نہیں' بعد میں ایک دفعہ ہڑتالیوں کے گروہ کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا کہ اسی وجہ سے میں اپنے گھر سے' گاؤں سے نکالا گیا اور آج وہی کام کر رہا ہوں۔ آخر کیا فرق پڑا۔ کیا فرق پڑتا ہے' ہیں نعیم؟......"

علی کی گاڑی پر ہاتھ رکھے ایک لمبے قد کا بڈھا' جس کا پھٹا ہوا لباس اور غلیظ داڑھی تھی' چل رہا تھا۔ نعیم نے کئی بار اس پہ نظر ڈالی اور ہر بار اسے غیر معمولی سا احساس ہوا۔ اس خستہ حالت کے باوجود بڈھے کی آنکھوں میں گہری ذہانت' گہری دردمندی اور گہرے رنج کی جھلک تھی۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔

UrduPhoto.com

نعیم تھکن کے مارے بوڑھے سے درخت کی طرح جھولتا ہوا اس کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ علی نے اس کی آستین کھینچی۔

"چلو چلو۔ پتا نہیں کون ہے۔"

"اسے بٹھالو۔ یہاں مر جائے گا۔"

"واہ وا۔ اگر اسی طرح کرنے لگے تو..... اب اگر یہ چلنے بھی لگے تو اسے ہاتھ رکھنے کو جگہ نہ ملے گی۔ دیکھو۔"

نعیم نے دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جس جگہ پر بڈھے کا ہاتھ تھا اسے حاصل کرنے کے لئے کئی ایک بڈھے اور نوجوان ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ گاڑی کے دونوں طرف اسی طرح کے لوگوں کی قطاریں تھیں، فاقہ زدہ، نیم مردہ بھیڑیوں کی طرح کے لوگ جو سر جھکائے ڈنڈوں کا سہارا لئے چل رہے تھے۔

نعیم اوندھے منہ گرے ہوئے بڈھے کے اوپر کھڑا جھولتا رہا۔ ناچار علی نے اس کی مدد سے بڈھے کو اٹھا کر گاڑی پر لادا اور پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

(۴۶)

اس رات [illegible] ایک کمزور سا بوڑھا [illegible] سے مرا تھا۔ اس کی بیماری کا کسی کو پتا نہ چلا کیونکہ وہ اکیلا سفر کر رہا تھا۔ صبح سویرے گاڑی کا سہارا لے کر چلنے والوں نے اسے گاڑی میں مرا ہوا پایا اور کود کر اوپر چڑھ گئے۔ چند ایک تو بیٹھتے ہی اونگھنے لگے دو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لیکن چونکہ گاڑی لاوارث تھی اس پر سوار ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جنہیں اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ڈنڈوں پر بیٹھنے لگے۔ نتیجتاً دونوں طرف کے بانس کے ڈنڈے بوجھ کے نیچے ٹوٹ گئے۔ آخر بیل پیچھے سے معذور ہو کر رک گئے۔ اب پیچھے رہ جانے کا عام خوف ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور خوفناک جدوجہد کی ابتدا ہوئی، طاقت ور اور کمزور کی ازلی، حیوانی رقابت۔ اس دھکم پیل میں گاڑی کے مالک کی لاش نیچے گر پڑی۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد جب چند زور آوروں نے گاڑی پر قبضہ کر لیا اور بیل دوبارہ چلنے لگے تو وہ اپنے پیچھے آنے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو بظاہر ان سے مخاطب تھے۔ اس قیامت کے شور میں وہ کچھ سن تو نہ سکے لیکن لوگوں کے تشویشناک اشاروں سے انہیں لاش کی غیر موجودگی کا احساس ہو گیا۔ گاڑی رکی، دو آدمی اتر کر گئے، مردے کو کندھوں پر اٹھا کر لائے اور گاڑی میں لاد کر روانہ ہوئے۔

لیکن موت کی خبر آناً فاناً سارے میں پھیل گئی اور ایک جگہ پہنچ کر سارے کا سارا قافلہ یک دم رک گیا۔ بہت سے لوگوں نے آ کر لاش کو گھیر لیا اور اسے ٹھکانے لگانے کی تجویزوں پر غور کرنے لگے۔ اب وہ لوگ جو گاڑی پر قابض تھے چوکنے ہوئے اور چالاکی کے ساتھ اتر کر ہجوم میں مل گئے۔ پھر انہیں میں سے دو نے اوپر چڑھ کر مرنے والے کا ایک بڑا سا صندوق خالی کیا اور لاش کو کپڑے میں لپیٹ کر اس میں رکھا۔ پھر نماز جنازہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

نماز کے بعد امام نے بیل گاڑی پر چڑھ کر ایک مختصر لیکن جوشیلی تقریر کے دوران کہا:

"ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ ہم اپنے مردوں کی حرمت کے پاسبان ہیں۔ آج ہمارے اس گمنام بھائی کو جس کا نام بھی بعض ضرورتوں کے تحت ہمیں خود ہی ایجاد کرنا پڑا وہ عظیم الشان جنازہ میسر ہوا ہے جو دنیا میں بڑے بڑے آدمیوں کو نہیں ملتا۔ دس ہزار روحیں...... دس ہزار مومن۔"

تقریر کے دوران اور تقریر کے بعد دیر تک لوگ ٹولیوں میں جنازے کے پاس سے گزرتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک حتی الوسع اس اجنبی انسان کا مردہ چہرہ دیکھنے کا خواہش مند تھا جو محض مر کر یکلخت ان سب کے لیے دردمندی' خدا ترسی اور مستقبل کے خوف کی عظیم علامت بن گیا تھا۔ چند ادھیڑ عمر کسان عورتیں اونچی آواز میں بین کرنے لگیں۔ ان پر آج پہلی بار موت کی عالمگیر حیثیت کا انکشاف ہوا تھا اور غیر شعوری طور پر انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اس ایک انسان کی موت ان سب کی موت تھی کہ مستقبل کے اندھیرے کی مشترکہ موت میں وہ سب شامل تھے۔

آخر اسے قبر میں اتار کر کم از کم پانچ ہزار افراد نے اپنے اپنے حصے کی مٹی اس پر ڈالی اور ایسی قبر بنائی کہ ان میں سے آج تک کسی نے اتنی بڑی قبر نہ دیکھی تھی۔

"زندگی کی ایک عظیم فورم (Form) ہے۔ یہ جنازہ۔" لمبے بڈھے نے مٹی پھینکتے ہوئے کہا۔ نعیم نے خاموشی سے اسے دیکھا اور اپنے حصے کی مٹی پھینک کر آگے روانہ ہو گیا۔ میلوں تک انہیں وہ قبر نظر آتی رہی۔

اس [illegible] انگلوں سے مسلح تھے۔ قافلے والے بہت سے مردہ اور زخمی چھوڑ کر آندھی کی طرح بھاگے۔ اب وہ موت سے واقف ہو چکے تھے۔

"تم کیا کہہ رہے تھے؟" نعیم نے پوچھا۔

"جنازے کی بات کر رہا تھا کہ یہ زندگی کیسی منظم ہے۔ 'خصوصاً موت' میں فلسفہ نہیں بگھار رہا۔ اس زندگی سے مراد یہ خصوصی زندگی ہے مذہب جس میں قواعد وضوابط ہیں اور ہمسائے کے ساتھ محبت کرنے کے احکام اور نماز کے اوقات' رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقے' نیکی کے بدلے ثواب اور گناہ کے بدلے عذاب ہے۔ کتنی بڑی تنظیم ہے' تم نے کبھی سوچا ہے؟ میں بھی کیا پوچھ رہا ہوں' ہر کوئی تھوڑا ہی سوچتا ہے۔ پر ستو میں نے سوچا ہے۔ وہ دیکھو اگلی بیل گاڑی پر ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ میں جب بھی ایسے شخص کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ابھی چند منٹ میں یہ اپنے ضمیر کا سارا بوجھ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے اطمینان سے بیٹھ جائے گا۔ اس کی زندگی کی ایک مخصوص شکل' ایک Form ہے جس کے مطابق کہ یہ رہتا ہے اور اس کا Content ہے جو کچھ کہ یہ کرتا ہے اور اس کے نیک و بد ہونے کا علم رکھتا ہے۔ پھر اس کی اجتماعی شکل ہے۔ نماز جنازہ' جس کی عظیم Form ہے اور جس کے Content میں تمام انسان شامل ہو جاتے ہیں۔ اس سارے سلسلے میں ایک رکھ رکھاؤ ہے' صاف ستھرا پن ہے' جیسے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر باورچی خانے کو جھاڑا پونچھا جائے' برتنوں کو مانجھ کر قرینے سے رکھا جائے اور

فرش کو دھو دھلا کر کھلا چھوڑ دیا جائے۔ اس میں فراغت کا احساس ہے۔ میری بھی کوئی زندگی رہی ہے۔ پریشان خیالی ابتری دھما چوکڑی ایک دم دھما چوکڑی۔ Form کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس زمرے میں کچھ تھا بھی تو مجبوری محض مجبوری اور لاچاری۔ اور Content؟ ہمم کیا بات کرتے ہو میاں کبھی کسی چیز کا تعین ہی نہیں ہو پایا...... لیکن اب میں تمہیں سب سے اہم بات بتانے والا ہوں سنو۔ اس کے باوجود ان سب باتوں کے باوجود میں نے کبھی ایسے لوگوں کے لئے ایسی زندگی کے لئے رشک یا حسد محسوس نہیں کیا۔ کبھی احساس کمتری مجھ کو نہیں ہوا۔ ہمیشہ میں نے اس نظام کے لئے اپنے دل میں ایک عجیب سی حقارت محسوس کی ہے کہ ہم اپنے ضمیر کو زبردستی دھو دھا کر منے گناہوں کے لئے تازہ دم ہو بیٹھتے ہیں نئی امنگ نئی حرص کے ساتھ۔ اور نماز جنازہ کے بعد کیا ہوتا ہے؟...... تم نے دیکھا ہی ہے۔ شکست اور بے حرمتی ہمیں عین آنکھوں میں آ کر لگتی ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"میں دلی یونیورسٹی میں تاریخ پڑھتا تھا۔"

"اس سے پہلے؟"

"میں ریل میں کام کرتا تھا۔"

"اس سے پہلے؟"

بڑھا [illegible]"

نعیم کی آنکھوں کے سامنے صاف طور پر مدتوں پہلے کی ایک دھوئیں سے بھری ہوئی کوٹھڑی آ گئی جس میں ایک جوشیلا نوجوان بیٹھا ضلع کے سارے انگریز افسران کو بموں سے اڑا دینے کی تجویزوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

بڈھے نے نعیم کے چہرے پر اچانک چھلکتی ہوئی پرانی آشنائی کی مسکراہٹ کو نہ دیکھا اور پھر بولنے لگا:

اس سے پہلے آئیڈیلز تھے اور آوارگی تھی۔ اگر میں تفصیل سے بیان کروں تو تم کہو گے کہ وہ آوارہ گردی کی زندگی تھی۔ مگر نہیں وہ محض آوارگی تھی۔ یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا۔ آئیڈیل...... اصل اور صحیح آئیڈیل تو مکمل نارمل حالات میں بنتے ہیں۔ ایسے ذہنوں میں جو پرُ شکم ہوتے ہیں عظیم اور بے ہوس ہوتے ہیں جن کے پاس صرف تخیل ہوتا ہے اور بلندی اور مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے انسان جن پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا کوئی ناکامی کوئی زہر نہیں ہوتا بس زندگی کی روح ہوتی ہے جو جوان اور خوبصورت اور افسردہ ہوتی ہے جو ان کو آس پاس کی گرتی ہوئی لاچار ہوتی ہوئی دنیا سے صرف مایوس کر دیتی ہے اور انہیں اپنے آپ سے الگ ہو کر اور اٹھ کر سوچنے کے قابل بناتی ہے آرٹسٹ اور شاعر کے پاس اپنے تجربے ہوتے ہیں آئیڈیلسٹ کے پاس بنی نوع انسان کی ساری تاریخ سارے تجربے اور سارے دکھ ہوتے ہیں چنانچہ وہ ان سے بڑا ہوتا ہے۔ ہم اور تم روزمرہ کا حساب رکھنے کے لئے تھے۔ ہمارے پاس کیا تھا؟ غم و غصہ اور آئیڈیلز کی بگڑی ہوئی شکل گالیاں اور برافروختگی مصیبتیں اور دباؤ اور نوجوانی اور خفت اور تنگ نظری اور زندگی کا سارا زہر سب کچھ تھا۔ سنو ایک بات بیچ میں آ گئی ہے۔ آئیڈیل اور سیاست میں

فرق ہے۔ سیاست میں ہوس کا مقام بہت اونچا ہے۔ سیاست دان محض اپنی ناک کے آگے سے گزرنے والے نفع و نقصان سے متعلق ہوتا ہے' اس کا ذہن بھدا اور تاریخ سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ آئیڈیل جس شے کی لطیف اور اعلیٰ شکل ہے' سیاست میں وہی چیز بھدی اور خام بن کر نمودار ہوتی ہے...... جس طرح ہر شے بالآخر بھدی اور خام بن جاتی ہے...... پھر بھی سیاست کی ہر ترکیب چونکہ سوسائٹی کے لئے نفع کی امید دلاتی ہے اس لئے اس کا وجود لوگوں میں گرمی اور زندگی پیدا کرتا ہے۔ ہمارے پاس نہ آئیڈیل تھے نہ سیاست' صرف بگڑی ہوئی زندگیاں تھیں اور زہریلے دماغ' جس کا نتیجہ اس بگڑی ہوئی تاریخ میں ظاہر ہوا ہے' یہ سب......'' اس نے چاروں طرف ہاتھ پھیلایا۔ ''تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔ یہ تاریخ کی کون سی شکل ہے؟ یہ وہ نسل ہے جو ایک ملک کی تاریخ میں عرصے کے بعد پیدا ہوتی رہتی ہے' جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا' کوئی خیالات کوئی نصب العین نہیں ہوتا جو پیدائش کے دن سے اداس ہوتی ہے اور اِدھر سے اُدھر سفر کرتی رہتی ہے۔ ہم ہندوستان کی اس بدقسمت نسل کے بیٹے ہیں......''

تھوڑی دیر کے بعد جب اس کا پہلا جوش ختم ہو گیا تو وہ دھیمے اداس لہجے میں اپنے متعلق بتانے لگا:

''میں نے یونیورسٹی میں تاریخ پڑھی۔ لیکن میں اس دنیا میں رہتا تھا جہاں آپ یا تعلقہ دار تھے یا کچھ بھی نہ تھے۔ جو لوگ اعلیٰ دماغ ہوتے تھے سرکاری ملازمت میں چلے جاتے تھے اور حکومت برطانیہ انھیں اس طور تربیت دیتی تھی کہ ان کی تمام ذہانت' تمام اچھوتا پن ختم ہو جاتا تھا۔ وہ نہ تعلقہ دار بن سکتے تھے نہ آرٹسٹ' محض سرکاری افسر بن کر رہ جاتے [illegible] یہیں ان کا خاتمہ تھا۔ آئیڈیل کہاں سے آتے؟ دوسری طرف ہماری دنیا تھی۔ اس میں مشقت کرتے ہوئے مزارعے تھے اور چھوٹے چھوٹے خودغرض تعلقہ داری اور چھوٹے اہلکار تھے۔ قرض تھے اور سود لینے والے مہاجن تھے اور جاگیرداروں کی قرقیاں تھیں' اور اس سب کے اوپر ان خداؤں کے ساتھ گونگی' کتوں کی سی وفاداری تھی۔ یہاں آئیڈیل بن ہی نہ سکتے تھے' یہاں صرف گری ہوئی زندگی تھی اور بے بس بزرگ اور عقل سے خالی بیٹے تھے جو بکتے تھے۔ تاریخ کی پڑھائی سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ محض کنفیوژن پیدا ہوا' خوفناک کنفیوژن۔ اگر میں سرکاری ملازمت کرتا تو آج تک اپنی تعلیم کا قرض اتارتا رہتا۔ چنانچہ میں بھاگ گیا۔ لیکن وہ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ سمجھتے ہو؟ ہم تم ہم عمر ہیں' ایک دوسرے کو سب کچھ بتا سکتے ہیں' تم ضرور سمجھ جاؤ گے۔ وہ زمانہ تھا جب اس سب کچھ کے باوجود آدمی اپنے خیالات کے ساتھ نوجوانی کی اولیں محبت کرتا ہے' جس کے ختم ہونے کا غم انسان عمر بھر ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے جس سے دل خالی ہو جاتے ہیں اور دماغ ناکارہ۔ اس وقت معمولی سے معمولی اور بیکار چیزوں میں نصب العین نظر آتا ہے اور انتہائی بے خیالی سے ہم زندگی کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے......''

''پھر؟ پھر تم بھی......؟''

''نہیں۔ میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں اس کے بعد کارندہ نہیں بنا' مگر میں نے وہ کیا جو مجھ کو کرنا چاہیے تھا' جو ہر کسی کو کرنا چاہیے تھا۔ میں محنت کر کے روزی کمانے لگا۔ یہ تاریخ کا وہ زمانہ ہے جس میں میں

کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ سب سے بڑا کام جو میں کرسکتا ہوں وہ خاموشی اور دیانت داری کے ساتھ رہنے کا ہے۔ یہ سب سے قدرتی طریقہ ہے جو انسان اختیار کرسکتا ہے کیونکہ دیانت داری اور شرافت کے ساتھ مسلسل دکھ سہتا ہوا انسان ہی دنیا کی واحد حقیقت ہے۔ میں نے کافی آرام کرلیا ہے۔ میرا خیال ہے اب میں بارہ گھنٹے تک چل سکتا ہوں۔ تم میری جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ آؤ آؤ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں کہہ رہا تھا اوہ...... میں بار بار دہرا رہا ہوں لیکن یہی دنیا کی واحد حقیقت ہے۔ سن رہے ہو؟ تم شاید سن بھی نہیں رہے' کیا فائدہ......"

انہیں چلتے ہوئے نو روز ہو چکے تھے۔ اب وہ جالندھر کے قریب پہنچ رہے تھے اور حالانکہ آدھے سے زیادہ نئے لوگ اس میں شامل ہو چکے تھے لیکن قافلے کا حجم حیرت انگیز طور پر گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوں جوں وہ پنجاب میں اندر آتے گئے حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے پانچ روز سے دن میں کئی کئی بار حملے ہو رہے تھے اور وہ ایک پل کے لئے بھی بے خبر ہو کر نہیں چل سکتے تھے۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے جو کہ زیادہ تر ریاست کی طرف سے آتے۔ پہلے پہل تو قافلے والے پچھ دیر ان کا مقابلہ کرتے رہے' اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ آوروں کے ہتھیاروں کے سامنے خاموشی سے مر جاتے یا بھاگ نکلتے۔ ہر حملے کے بعد مردوں اور زخمیوں کو پھلانگتے ہوئے' روندتے ہوئے قافلے والے آگے نکل جاتے' کئی ایک سمت کا احساس کھو کر قافلے سے بچھڑ [illegible] نئی تازہ جماعت ان سے آملتی مگر کم ہونے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی اور قافلہ گھٹتا جاتا۔ پچھلے پچاس میل سے اچانک انہیں اپنے راستے میں مردہ اور نیم مردہ انسانی جسم ملنا شروع ہو گئے تھے جو سڑک پر اور آس پاس کے کھیتوں میں بکھرے پڑے تھے اور پتا دیتے تھے کہ ان سے آگے آگے ایک اور قافلہ رواں تھا' ایک مہیب زخمی جانور کی طرح جو خون کی لکیر چھوڑتا ہوا آگے آگے بھاگ رہا ہو۔ تو وہ اسی عجلت اور لاپروائی کے ساتھ ان اجنبی مردہ جسموں کو پھلانگتے ہوئے گزر رہے تھے مگر اس خیال سے کہ ان سے آگے' ان سے پہلے کچھ اور لوگ' دوسرے ناواقف لوگ موت کا سامنا کر رہے تھے انہیں عجیب سے طمانیت کا احساس ہوا۔ موت جو مشترکہ تھی اور راستے میں بکھری ہوئی تھی اور جس کے اوپر سے ہزاروں انسانی پاؤں بظاہر یکتائی اور بے نیازی کے ساتھ بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے آخرکار اسے دھوکہ دیا جا سکتا تھا' ٹالا جا سکتا تھا' دوسرے کے سر تھوپا جا سکتا تھا۔

اس خیال کو یوں بھی تقویت ملتی کہ بعض دفعہ اگلے قافلے کے حملہ آور انہیں بغیر کچھ کہے گزر جانے دیتے۔ وہ مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کے کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش' خوفزدہ کوچ سے ہی محظوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردوں اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزر جاتا۔ کبھی کبھار ان کی زد سے باہر نکل کر ایک آدھ پرانا آدمی رک کر دور سے جلتے ہوئے انسانی جسموں کا نظارہ کرتا اور اس کے ذہن میں قافلے کی پہلی لاش کی یاد تازہ ہو جاتی۔ زیادہ تر

UrduPhoto.com

لوگ نئے ساتھیوں اور نئے حملوں کی توقع میں اپنا سفر جاری رکھتے۔

نعیم اس افراتفری میں کئی بار علی سے بچھڑ گیا۔ مگر علی ہر دفعہ اسے تلاش کر لیتا۔ وہ گاڑی کے اوپر ایڑیاں اٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور چاروں طرف نظر دوڑاتا' پھر ایک طرف کو نظریں جما کر گاڑی سے اترتا' ہجوم کو چیرتا ہوا سیدھا جاتا اور سر جھکا کر چلتے ہوئے نعیم کو بازو سے پکڑ کر برا بھلا کہتا ہوا واپس لے آتا۔ ''اپنی گاڑی کو مت چھوڑو' مت چھوڑو تین ہزار بار کہا ہے۔ مگر تم تو بالکل کام سے گئے۔ وہ پکڑ لیں گے اور مار دیں گے اور چلے جائیں گے۔ بس۔ پھر؟'' وہ کہتا۔ لیکن نعیم سارے کاموں سے جا چکا تھا۔ بوڑھا پروفیسر بھی اب اس سے باتیں کرنے کی ناکام کوشش کر کر کے تھک چکا تھا اور آخر اس نے علی سے کہا تھا۔ ''تمہارا بھائی...... اس کے دماغ پر اثر ہے۔ خیال رکھنا پڑے گا۔'' اور علی' جو شروع سے بڈھے پروفیسر کی طرف سے لاپرواہ تھا' یہ سوچ کر خوش ہوا کہ اب وہ جب چاہے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔

وہ سب کچھ دیکھتا بھالتا رہتا اور کبھی کبھی ہوشیار ہو کر چل رہا تھا۔ اس کی صورت اپنے دوسرے ہم عمروں سے قطعی مختلف نہ تھی۔ سب کی داڑھیاں اور چہرے غلیظ' لباس پھٹے ہوئے اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ سب ننگے پاؤں تھے کیونکہ جوتے تنگ ہو چکے تھے۔ سب کی نظریں گونگی اور آوارہ تھیں اور ان سے طویل' بے منزل مسافرت کی تکلیف جھلکتی تھی۔ سب کے نزدیک اہم ترین کام چلتے جانا اور اکٹھے رہنا تھا اور وہ ان سب میں گھلا ملا ہوا' کھویا ہوا [illegible] حملے ہو رہے تھے لوگ مر رہے تھے جو مارے جانے سے بچ رہتے وہ تھک کر گر رہے تھے' سامان کو آگ لگائی جا رہی تھی اور لوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے ساتھ کھڑا کھڑا مر گیا۔ عورتوں کے ننگے مردہ جسم بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے اور جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے وہ مسلسل چل رہے تھے اور میاں بیوی' بہن بھائی اور ماں اور بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو دنیا کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ لیکن یہ سب اہم نہیں تھا' کیونکہ وہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود خاموش اور لاتعلق تھا۔

''تم بولتے کیوں نہیں؟'' آخر جھنجلا کر علی نے کہا۔ ''تھو تھو یعنی پانچ روز ہو گئے...... پورے پانچ اور بات تک کر کے نہیں دی اس شخص نے۔ تھو تھو......''

''دماغ پر اثر......'' پروفیسر نے کہنا چاہا۔

''چپ رہو تم۔ نیچے اترو...... چلو۔'' علی نے اس کی پشت پر دھپ جما کر گاڑی سے اتار دیا۔

نعیم نے تیز روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور چالاکی سے مسکرایا۔ پھر اس نے عائشہ پر نظر ڈالی جو گاڑی میں لیٹی تھی اور چارے کا ڈھیر' جس میں اپنے آپ کو چھپانے کے لئے اس نے گھر بنا رکھا تھا' ختم ہو چکا تھا۔ وہ بہرحال اتنی سوکھ چکی تھی کہ کسی نے اسے مارنے یا اغوا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ نعیم آہستہ سے

ہنسا۔ پھر وہ تیز تیز چل کر بیلوں کے پاس پہنچا اور ان کی پسلیوں پر' جو باہر نکلی ہوئی تھیں' ہاتھ پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ پروفیسر اور علی گم سم' ترحم خیز تعجب کے ساتھ اسے دیکھتے رہے' پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مایوسی سے سر ہلانے لگے۔

ایک نشہ تھا' ایک بدمستی تھی جس میں سب کچھ ڈوب چکا تھا' غرق ہو چکا تھا' جس کا منبع کسی کے علم میں نہ تھا۔ ایک بے خودی' جو زندگی کی سفاکی کے اس سارے منظر کو بہا کرلے گئی تھی' پار کر گئی تھی' جس نے ہر انسانی اور حیوانی جذبے کو' تجربے کو فتح کر کے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی' کیونکر پیدا ہوئی تھی اور کدھر لئے جا رہی تھی' اس سے وہ قطعی نا آشنا تھا۔ صرف ایک غبار تھا' روشن اور لطیف اور بے ہیئت' جیسے خزاں کی شفاف راتوں کی کہکشاں' یا جاڑوں کی صبحوں کی دھند جو چھوئی نہیں جاتی مگر کپڑوں میں گھس کر سارے جسم کو گیلا کر دیتی ہے اور خوبصورت اور خنک ہوتی ہے' جس میں آپ چلتے جاتے ہیں چلتے جاتے ہیں اور نئی نئی چیزیں نمودار ہوتی جاتی ہیں' مرد اور عورتیں' گھوڑا گاڑیاں' پیچھے روزمرہ کی مانوس شکلیں' مگر دھند میں سے نکلی ہوئی وہ انوکھی اور خنک اور خوبصورتی ہوتی ہیں' خواب کی طرح۔ بس ایسا غبار تھا جو شروع دن سے بلند ہو رہا تھا' جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جسے اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا' موت اور بھوک اور بے کسی اور خوف اور لالچ کے ساتھ ساتھ جسم کی بڑھتی ہوئی تھکن کے پہلو بہ پہلو' کچھ ختم ہو گیا تھا۔

دم توڑتا ہوا جسم جو اس کا خیال تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی اذیت تھی اور مایوسی کا نقطہ عروج' جہاں پہنچ کر اب نہ وہ بھاگتے تھے نہ پروا کرتے تھے' حملہ آور ان میں سے چند ایک کو ہانک کرلے جاتے تھے اور سڑک کے کنارے کھڑا کر کے گولی کا مار دیتے تھے' سب ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ جسے اس نے محسوس کیا تھا آخر ان سب سے زیادہ طاقتور اور روشن اور جاندار تھا اور اسے مکمل طور پر لپیٹ میں لئے ہوئے تھا' جہاں بالآخر خاموشی تھی' اور وجد۔

قافلے والوں کا کاروبار بہرحال چل رہا تھا۔ شہر کے باہر وہ پناہ گزین کیمپ میں پہنچ کر رک گئے۔ یہاں ان کو رات بسر کرنا تھی۔ کیمپ چند کچی بارکوں اور پھٹے ہوئے خیموں پر مشتمل تھا۔ بارش کا پانی جگہ جگہ رکا ہوا تھا۔ پرانے اور نئے پناہ گزینوں نے ایک دوسرے کو شک وشبے کی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ بیٹھ گئے اور پتھروں کے چولہوں پر روٹیاں پکانے لگے۔ جن کے پاس توے نہیں تھے وہ گول گول پتھروں پر آٹا لپیٹ کر آگ پر گرم کرنے لگے۔ جن کے پاس آٹا نہ تھا وہ بھاری رقمیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے۔ جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرنے لگے جب اندھیرے میں چوری کی جا سکتی تھی یا گھر کی عورتوں میں سے کسی جوان اور خوش شکل کو تھوڑی دیر کے لئے کسی دوسرے کے حوالے کر کے' کہ حیوانی جذبے اور ان کے پالنے والے ہر حالت میں زندہ رہتے ہیں' معاوضے میں اشیائے خوردنی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ کچھ لوگ بہرحال اتنے تھک چکے تھے کہ آتے ہی غش کھا کر پڑ رہے اور ہوش میں آنے پر گڑھوں میں رکا ہوا پانی پی کر دوبارہ گہری نیند سو گئے اور مکھیاں ان کے منہ پر جمع ہونے لگیں اور جنگلی پرندے انہیں مردہ سمجھ کر چونچیں مارنے لگے۔ پھر چند ایک ایسے بھی تھے جو محض ہونقوں کی